مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ

افکار و شخصیات کا تقابلی مطالعہ —— چند اشارات

(از جناب ابوسلمان صاحب شاہجہاں پوری)

دو شخصیتوں کا موازنہ اور مقابلہ کسی ایک شخصیت کے ارادت مندوں کے لئے دل شکنی کا باعث بھی ہو سکتا ہے لیکن ایک شخصیت کے سہارے دوسری شخصیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں جو مدد ملتی ہے اس کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر احتیاط کی جائے تو کسی ایک شخصیت کے عقیدت مندوں کی دل شکنی کے بغیر بھی شخصیات کے مطالعہ کا یہ مفید اور دلچسپ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ذیل کی سطروں میں ہم اسی قسم کی ایک کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں تفصیلی مطالعہ مقصود نہیں ہے بلکہ محض اشارات مقصود ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی دو ایسی شخصیتیں ہیں جن کے افکار و خیالات، عقائد و نظریات، اندازِ فکر و نظر اور زندگی کی اٹھان میں سب سے زیادہ مناسبت اور مطابقت پائی جاتی ہے۔

مولانا سندھی عمر میں مولانا آزاد سے تقریباً ۱۶ برس بڑے تھے، مولانا سندھی مارچ ۱۸۷۲ء میں اور مولانا آزاد ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے، مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین دہلوی مذہبی زندگی میں رسمی و روایتی طریقے کو پسند کرتے تھے۔ مذہبی عقائد و اعمال میں یہ رسمی طریقہ وہی تھا جس نے بعد میں "بریلویت" کا نام اختیار کیا اور آج "بریلوی مکتبِ فکر" کے نام سے اس گروہ کو عام طور پر جانا پہچانا جاتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کو یہ رسمی مذہبی زندگی پسند نہ آئی، ان کی فطرت صالحہ نے شروع ہی میں یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اسلام محض چند رسوم کا نام ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد کی تعلیم میں شروع سے

بڑا اہتمام اور تربیت میں بڑی سختی کی گئی تھی، ابتدائی تعلیم خود ان کے والد نے دی، جب ذرا آگے بڑھے تو دوسرے اساتذہ کو مقرر کیا گیا، لیکن ان کی علمی استعداد اور خاص طور پر ان کے مذہبی عقائد کو خوب جانچ پرکھ لیا گیا تھا۔ گھر میں کسی ایسے شخص کا گذر نہ تھا جس کے عقائد کے بارے میں شک و شبہ ہو، باہر آنے جانے کی بھی آزادی نہ تھی، باہر نکلتے تو خادم ساتھ ہوتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سختیاں اور بندشیں ہمیشہ باقی نہ رہ سکتی تھیں، خود بخود حالات ایسے پیدا ہوتے گئے کہ باہر کی دنیا سے ربط وضبط بڑھا اور گنبد سے باہر کی بھی ہوا لگی۔ ۱۱ سال کی عمر میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اس شوق نے علمی و ادبی کتب و رسائل تک رہنمائی کی، اس زمانے کے تمام مشہور مصنفین کی کتابیں مطالعہ میں آئیں۔ سر سید کی شخصیت سے خاص طور پر متاثر ہوئے، انہی کی کتب و رسائل سے امام غزالیؒ کے بعض رسائل دیکھنے کا شوق ہوا۔ کتب بینی کے اس شوق نے ایک اہلِ حدیث عالم کا کتب خانہ خریدوایا۔ اس میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی کتابیں موجود تھیں اس طرح خود بخود حالات ایسے پیدا ہو گئے جو ان کو اپنے والد کے مقابلے میں دوسری انتہا پر لے جانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور خانوادۂ ولی اللہی سے وہ پہلے ہی واقف تھے، ان کے والد اسی سلسلۂ درس و تدریس سے تعلق رکھتے تھے لیکن مولانا آزاد کی تعلیم و تربیت میں انکو خانوادۂ ولی اللہی سے ایک خاص انداز میں واقف کرایا گیا تھا۔ حضرت نواب صاحب اور دیگر حضرات کی کتب و رسائل سے ان کو خانوادۂ ولی اللہی کے علوم و افکار اور ان کی خدماتِ جلیلہ کے ایک دوسرے پہلو سے بھی واقفیت ہوئی جو ابھی تک ان کی نظروں سے شاید بالکل اوجھل تھا۔

مولانا آزاد کی طبیعت نے جو نیا رُخ اختیار کرنا شروع کیا تھا اس میں ایک شخصیت کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ شخصیت مولانا محمد یوسف جعفری رنجور کی تھی۔ مولوی صاحب مرحوم پٹنہ کے ایک سرفروش اور مجاہد خاندان سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد کا نام مولوی یحییٰ علی تھا۔ جو حضرت سید احمد بریلوی کی تحریکِ اصلاح و جہاد کے ایک خاص رکن تھے، حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد تحریک دو حصوں میں بٹ گئی، صادق پوری جماعت کے امیر مولانا ولایت علی تھے ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی عنایت علی امیر بنے۔ جب انھوں نے سرحد کو ہجرت کی تو جماعت کا تمام نظام مولوی یحییٰ علی کے ہاتھ میں آ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ حریت میں حصہ لینے کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اور وہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔ مولوی رنجور مرحوم بورڈ آف اگزامینیشن کے چیف مولوی تھے، آپ

کہنہ مشق شاعر تھے اور کلکتہ کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کو شعر و شاعری کا شوق ہوا اور مشاعروں میں شرکت شروع کی تو مولوی رنجور مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی اور رفتہ رفتہ گہرے مراسم اور مخلصانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ مولانا آزاد کے جو مکاتیب مولوی رنجور کے نام ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے خیالات کی تبدیلی اور ان کے والد کے الفاظ میں "گمراہی" کا باعث مولوی صاحب مرحوم تھے۔ غرضیکہ مولوی رنجور کے ذریعہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ اصلاح و جہاد، ان کی جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں، حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کی سرفروشانہ و جاں سپارانہ زندگی، اصلاحِ مسلمین کے سلسلے میں ان کی عظیم الشان خدمات اور ان کی مومنانہ فراست اور مجاہدانہ کردار سے پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں واقف ہوئے، مولانا آزاد کے والد، حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کے کفر پر ایمان رکھتے تھے اور اس معاملہ میں ان کے غلو اور تشدد کا جو عالم تھا وہ مولانا ملیح آبادی کی روایات (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی) سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ مولانا آزاد بھی اس پر افسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اپنے والد کی انتہا پسندی کے مقابلہ میں مولانا آزاد حضرتِ شہیدؒ کو مجدد و سلطانِ وقت اور اسکندرِ عزم کے لقب سے یاد کرتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے کام کو مولانا آزاد نے تجدید و تدوینِ علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحابِ استعداد تک محدود رکھا ہے لیکن حضرتِ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے کام کو عملاً تجدیدِ اسلام و احیائے دین اور فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع سے تعبیر کیا ہے بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اگر حضرتِ مجدد شہید کے زمانہ میں حضرت شاہ ولی اللہ بھی ہوتے تو انہی کے جھنڈے تلے ہوتے؛ مولانا آزاد کو فکر و نظر کے اس مقام تک پہنچانے میں یقیناً دوسرے عوامل بھی تھے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس معاملہ میں مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کی شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی صاحب مرحوم کی تحریک پر مولانا آزادؒ نے "الدر المنثور فی تراجم اہلِ صادقفور معروف بہ تذکرۂ صادقہ" پر ایک تقریظ اور قطعۂ تصنیف (۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء) اور قطعۂ تاریخِ طباعت (۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء) بھی لکھا تھا جو تذکرۂ صادقہ میں شامل ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کی فرمائش پر مولانا نے ایک تقریظ فارسی نظم میں بھی لکھی تھی، جس کی طرف مطبوعہ تقریظ میں اشارہ موجود ہے، لیکن یہ تقریظ دقتِ گنجائش کی وجہ سے شاملِ کتاب نہ ہو سکی تھی، یہ نایاب و غیر مطبوعہ فارسی زبان میں منظوم تقریظ مولوی صاحب مرحوم کے ذخیرۂ علمی سے دستیاب ہو گئی ہے۔ پھر انھوں نے ۱۹۰۲ء میں لسان الصدق میں تذکرۂ صادقہ پر شاندار تبصرہ فرمایا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو بھی اس قسم کے حالات سے سابقہ پڑا۔ مولانا سندھی ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے لیکن یہ رسمی مذہب ان کو مطمئن نہ کر سکا، غور و فکر کا مادہ ان کے اندر ابتدائی عمر سے تھا، ان کی صالح فطرت نہ کسی غلط بات کو قبول کر سکتی تھی نہ انقلابی طبیعت کسی رسمی چیز پر مطمئن ہو سکتی تھی، انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں یہ محسوس کر لیا کہ مذہب محض چند رسوم کا نام نہیں ہو سکتا۔ مذہب زندگی کے ایک عقیدہ کا نام ہے اور عقیدہ کی بنیاد حقائق پر ہونی چاہئے نہ کہ محض چند رسوم و روایات پر —— زندگی کا عقیدہ بنانے کے لئے انھیں ایک ایسے مذہب کی ضرورت تھی جس کی بنیاد رسوم و روایات کی بجائے حقائق پر ہو۔ اُن کی طلب و جستجو نے انھیں اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ وہ حقیقی اور سچا مذہب جس کی انھیں طلب و تلاش ہے۔ ان کا اپنا آبائی مذہب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس وقت تک مولانا سندھی نہ تو سکھ مذہب اور ہندو مذہب کا گہرا مطالعہ کر سکے تھے نہ اسلام ہی سے قریبی اور صحیح واقفیت تھی لیکن معمولی اور سطحی سوالات کا جواب بھی سکھ اور ہندو مذہب کے مقابلے میں انھیں اسلام میں اطمینان بخش نظر آتا تھا۔ اس مقام پر پہنچ کر انھیں ایک سخت کش مکش سے گذرنا پڑا۔ ایک طرف ماں کی تمنائیں، اور اس کے ارمان تھے، بہنوں کی محبتیں اور ان کا پیار تھا اور ماموں کی شفقتیں تھیں، لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد ان محبتوں، شفقتوں، لاڈ اور پیار کا مرکز بنا رہنا تو درکنار، اس گھر میں بھی نہ رہ سکتے تھے، یہ دو ایسی انتہائیں تھیں، جن کی درمیانی راہ بھی کوئی نہ تھی، اگر ماں، بہنوں اور ماموں کی محبت کی طرف دیکھتے ہیں تو زندگی کے صحیح اور بلند عقیدے سے محروم رہتے ہیں اور عقیدے کی صحت و درستگی کا خیال کرتے ہیں تو اعزہ کی محبتوں کا انھیں مایوس کن جواب دینا پڑتا ہے لیکن اس بچے کی صالح فطرت عقیدہ اور نظریہ کے بارے میں کسی غلط چیز کو قبول بھی نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے گھر چھوڑ دینے کا قطعی اور آخری فیصلہ کر لیا۔ اُن کا فیصلہ اٹل اور عزم راسخ تھا، ایک شب تن تنہا گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

مولانا آزاد کو بھی زندگی کے ابتدائی دور میں اسی قسم کی کش مکش سے گذرنا پڑا۔ جو عقیدہ ان کے دل میں جگہ پا رہا تھا، وہ ان کے والد مرحوم و مغفور کی نظر میں اتنا ہی قابلِ نفرت تھا، جتنا کہ مولانا سندھی کے ماموں اور ماں کی نظر میں "اسلام" ہو سکتا تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ قابلِ نفریں، ایک سکھ ایک مسلمان کو گوارہ کر سکتا ہے لیکن مولانا خیرالدین مرحوم کی خوش عقیدگی اسلام کے بارے میں ان تصورات کو گوارا نہ کر سکتی تھی جو اُن کے بیٹے (ابوالکلام آزاد)

کے دل کو اچھے لگتے اور صحیح معلوم ہوتے تھے، اس زمانہ میں مولانا آزاد کو سخت ذہنی کلفتوں اور کشمکشوں سے گذرنا پڑا۔ ابھی تک وہ باپ، بھائی اور بہنوں کے چہیتے تھے لیکن جوں ہی ان کے موروثی عقائد میں تبدیلی ہوئی وہ گھر بھر کی نفرتوں کا مرکز بن گئے۔ لیکن عقیدے کے معاملہ میں انھوں نے بھی کسی ایسی چیز کو گوارا نہ کیا جو ان کے خیال میں صحیح نہ تھی، یہ کشمکش صرف چند دن کی نہ تھی بلکہ برسوں انھیں اِن حالات سے مقابلہ کرنا پڑا، ان کی خاندانی زندگی اور روایات ایک طرف تھیں اور ان کی بے میل طبیعت اور صالح فطرت دوسری طرف رہنمائی کر رہی تھی، انھوں نے اپنی صالح فطرت کی آواز پر لبیک کہا اور ان تمام مشکلات اور مصائب کو برداشت کر لیا جو اس راہ میں انھیں پیش آئے۔

مولانا آزاد اور مولانا سندھی کی سیرتوں کا یہ پہلو پوری طرح نمایاں ہے کہ وہ اصول اور عقیدے کو حالات کے کسی موڑ پر اور کسی مرحلے میں چھوڑنا گوارا نہ کر سکتے تھے، وہ دوسروں کو اس بات کا حق دیتے تھے اور اس سے ہمیشہ خوش ہوتے تھے کہ ان کے اصول اور فکر و نظر سے اختلاف کیا جائے لیکن یہ بات ان کے نزدیک دیانت کے خلاف تھی کہ علم و بصیرت کے خلاف محض کسی دباؤ یا لالچ کی بناء پر اصول ترک کر دیا جائے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی اور مولانا آزاد دونوں کے حالات میں بہت بڑا فرق ہے، ایک کو اپنا آبائی مذہب ترک کر کے ایک دوسرا مذہب اختیار کرنا پڑا، دوسرے نے اسلام کے صرف ایک فرقے کے عقائد سے انکار کیا اور اسلام ہی کے دوسرے فرقے کے عقائد کو اپنا لیا، لیکن واقعتہً دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ مولانا آزاد کے والد کی نظر میں دوسرا مسلک رکھنے والے مسلمان ویسے ہی کافر تھے جیسے ہندو یا سکھ ہو سکتے تھے۔ کم از کم مولانا خیر الدین حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کے بارے میں ایسا ہی عقیدہ رکھتے تھے۔

مولانا سندھی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ذریعے شاہ ولی اللہؒ کے فکر، سید احمد بریلوی کی تحریکِ اصلاح و جہاد اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے کارناموں سے واقف ہوئے، مولانا آزاد کی شناسائی بھی ابتدا ہی میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادہ و تربیت یافتگان اور اس سلسلے کے دوسرے بزرگوں سے ہو گئی۔

اس طرح برصغیر پاک و ہند کی یہ دونوں بزرگ ہستیاں ایک ہی سرچشمہ سے فیضیاب ہوئیں۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کے افکار اور اندازِ فکر میں، بڑی مطابقت پائی جاتی ہے، بلکہ دونوں کے کردار میں بھی اس قدر مطابقت پائی جاتی ہے جو برصغیر کے دیگر دو علما میں نظر نہیں آتی۔

مولانا عبیداللہ سندھی مولانا آزاد سے واقف اور ان کی الہلال کی تحریک سے متاثر ہوئے، انھوں نے مولانا آزاد کے طریقۂ کار سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس کا ساتھ دیا۔ مولانا آزاد کی "حزب اللہ" اور مولانا سندھی کی "دائرۃ المعارف" ایک ہی تحریک کی دو صورتیں تھیں، دونوں کے مقاصد ایک ہی تھے، فرق صرف یہ تھا کہ مولانا آزاد نے حزب اللہ کی تنظیم کسی جامعہ یا دارالعلوم کے طلباء تک محدود نہ رکھی جبکہ مولانا سندھی نے دارالعلوم دیوبند کے قدیم طلباء کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور ان کی تنظیم و تربیت کے لئے ہمہ تن مصروف ہو گئے لیکن ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی حضرت شیخ الہند کے حکم سے کابل چلے گئے، اوائل ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کو کلکتہ سے نکل جانے کا حکم ملا۔ مولانا رانچی چلے گئے اور کچھ دن بعد وہیں نظر بند کر دیئے گئے۔ ان وجوہ سے حزب اللہ اور دائرۃ المعارف کی تحریک و تنظیم ختم ہو گئی۔

تحریک الہلال کے متعلق حضرت شیخ الہندؒ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ "ہم سب اپنا اصل کام بھولے ہوئے تھے، الہلال نے یاد دلایا" ہند پاکستان کے چوٹی کے علماء میں حضرت شیخ الہندؒ کی واحد شخصیت تھی جس نے تحریکِ الہلال کی اہمیت کو سب سے پہلے محسوس کیا اور یہ خیال کئے بغیر کہ داعی ایک ایسا نوجوان ہے جس کی عمر ۲۵، ۲۶ برس سے زیادہ نہیں، مولانا کی دعوت کو قبول کر لیا۔

ترجمان القرآن جلد دوم میں سورۂ توبہ کی آیت ۴۹ کے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا، ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصدِ وقت پر توجہ دلاؤں، ممکن ہے چند اصحابِ رشد و عمل نکل آئیں، چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی، لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ ائذن لی ولا تفتنی ۔ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی۔" (صفحہ ۹۵)

عام طور پر لوگ الہلال کی دعوت اور اس سے متعلق علماء کے تاثر سے واقف ہیں لیکن وہ اس سے واقف نہیں کہ علماء کو عزائم و مقاصدِ وقت کی طرف مولانا سندھی کے ذریعے مولانا آزاد نے توجہ دلائی تھی۔

مولوی محی الدین احمد قصوری کے نام ایک خط میں التزام جماعت اور اتباع سوادِ اعظم کے سلسلۂ بحث میں مولانا فرماتے ہیں:-

" ۱۹۱۴ء میں جب میں نے ہندوستان کے بعض اکابر علماء و مشائخ کو عزم و سعی کی دعوت دی، بعض سے خود ملا، اور بعض کے پاس مولانا عبید اللہ سندھی کو بھیجا تو اکثر نے بعینہٖ یہی بات کہی تھی جو آپ کہہ رہے ہیں، یعنی علماء و مشائخ کی اتنی بڑی تعداد ملک میں موجود ہے، کسی نے بھی آج تک یہ دعوت نہیں دی۔ اب سوادِ اعظم کے خلاف قدم کیوں اٹھایا جا رہا ہے؟ ان ھٰذا الا اختلاق![1] "

لیکن یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مولانا سندھی کا تعارف مولانا آزاد سے خود حضرت شیخ الہندؒ نے کرایا تھا۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے کابل میں ایک مدت گذارنے، بین الاقوامی سیاسی حالات خصوصاً اسلامی ممالک کی سیاست کا قریب سے مطالعہ کرنے اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنے لئے کچھ اصول ترتیب دیئے اور ایک مخصوص طریقۂ کار اختیار کیا۔ تقریباً انہی دنوں مولانا آزاد نے رانچی کے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر حالات پر از سرِ نو غور کیا۔ اور ہندوستان کے مخصوص حالات میں اپنے لئے ایک مذہبِ عمل ترتیب دیا۔ اس بات کو محض اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا کہ دونوں بزرگ ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ مولانا آزاد کے مذہبِ عمل اور مولانا سندھی کے اصول و طریقِ کار میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ دونوں کی نظر عمیق تھی، دونوں کا اندازِ فکر اور طریقِ تجزیۂ حالات ایک تھا۔ اور دونوں ولی اللٰہی فکر اور مسلک سے متاثر تھے، اس لئے جوں ہی حالات نے دونوں کو غور و فکر پر مجبور کیا۔ دونوں ایک ہی نتیجہ پر پہنچے اور دونوں ان اصولوں پر قائم ہو گئے، حالانکہ دونوں بزرگوں کی زندگی مختلف حالات میں بسر ہوئی اور دونوں کی زندگی میں ایسے بیشمار مواقع آئے کہ ہر شخص ان حالات میں ثابت قدم نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن چوں کہ دونوں کو اپنے نظریات اور بنیادی اصولوں پر کامل یقین تھا اس لئے فروعات میں کوئی ایسی بات گوارا نہ کی جو ان کے بنیادی اصولوں اور نظریوں کے خلاف ہوئی۔ اس اصول پسندی اور استقامت کی وجہ سے دونوں کو عوام و خواص کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور بعض بڑے کٹھن مرحلے آئے لیکن انھوں نے اپنے نظریات کو نہ چھوڑا اور اصل پر فرع کو کبھی ترجیح نہ دی۔

---

[1] تبرکاتِ آزاد ص۲۴۲ مرتبہ مولانا غلام رسول مہر صاحب۔

مولانا آزاد اور مولانا سندھی کے اندازِ فکر کی ایک بڑی خوبی اس کی وسعت اور ہمہ گیری ہے، دونوں بزرگ معاملات و مسائل پر غور کرتے ہوئے اس کے پس منظر کو نظر انداز نہیں کرتے۔ نیز مسئلے کی عملی حیثیت کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے، ان کے نزدیک زندگی اور زندگی کے مسائل و مطالبات کا جواب صرف جذبات اور منطق سے نہیں دیا جاسکتا، ان کے اندازِ فکر کی اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ جب وہ انسانی صلاح و فلاح کی کسی ایک سطح پر سوچتے ہیں تو اس سے بلند تر سطح و تقاضوں اور ادنیٰ سطح کی ضرورتوں سے آنکھیں بند نہیں کرلیتے۔ یعنی اگر وہ ملکی اور قومی سطح پر انسان کی صلاح و فلاح کی بات سوچیں گے تو اس سے بلند تر (بین الاقوامی) سطح کے تقاضے یا اس سے ادنیٰ (جماعتی) سطح کے حالات اور ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ لیکن وہ انفرادی مفاد کے مقابلے میں اجتماعی اور کسی مخصوص گروہ یا جماعت کے مفاد کے مقابلے میں عمومی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

دونوں بزرگ ملتِ اسلامیہ کے رہنما تھے، لیکن رہنمائی کے عام تصور سے ان کا دماغ ناآشنا تھا، رہنمائی کے عام تصور سے میری مراد ملت کے مطالبات اور خواہشات کی محض ترجمانی اور پیروی ہے۔ حالانکہ کبھی یہ خواہشات غلط بھی ہوتی ہیں اور مطالبات کسی دوسری جماعت کے بہت بڑے نقصان کا باعث بھی ہوسکتے ہیں۔ رہنمائی کے عام تصور کے مطابق جانتے بوجھتے ہوئے بھی ایک رہنما کو ان غلط رجحانات اور مطالبات میں قوم کی رہنمائی کرنی چاہئے۔ حقیقتاً یہ مقام قوم کے رہنما کا نہیں ہوتا بلکہ قوم کے ترجمان اور وکیل کا ہوتا ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا سندھی ان معنوں میں قوم کے رہنما نہ تھے۔ انھوں نے اپنی بصیرت اور علم کے مطابق قوم کی رہنمائی کی، لیکن محض ترجمان بننے کا ننگ گوارا نہ کیا۔

اس قسم کی شخصیت کبھی کسی قوم یا گروہ کی مقبول ترین رہنما شخصیت نہیں بن سکتی۔ لیکن رہنمائی کا جامہ ایسی ہی شخصیت پر زیب دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو اپنا کر دونوں شخصیتوں کے بارے میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ انکے کردار میں کوئی اینچ پیچ نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دونوں کو زندگی میں کبھی اصول و نظریات کی صحت میں شبہ نہیں ہوا۔ لیکن وہ حضرات جو رہنمائی کے مقام کے مقابلہ میں ترجمان کے منصب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، ان کے خیالات اُلجھے ہوئے اور کردار بڑا پیچیدہ ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے مختلف طبقات میں ہر وقت خیالات کا تصادم اور مفادات کی کشمکش جاری رہتی ہے اور ان رہنماؤں کو اس کی تائید و ترجمانی کرنی پڑتی ہے۔ اس طبقاتی

کشمکش اور تصادم سے ان کا ذہن و فکر اور کردار متاثر ہوتا رہتا ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا سندھی چوں کہ اس قسم کے رہنما نہ تھے اس لئے قوم کے طبقاتی خیالات کے تصادم اور گروہی مفادات کی کشمکش سے ان کا ذہن و فکر کبھی متاثر نہیں ہوا، نہ اُن کے کردار پر اس کا اثر پڑا۔ قوم کے اندرونی اور بیرونی تصادموں اور کشمکشوں میں وہ اپنے بلند اصول و افکار کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ دونوں کا بہت وسیع و عمیق ہے۔ واقعات و حالات کے متعلق اندازِ فکر و تجزیہ دونوں کا ایک سا ہے۔ وہ محض تاریخ کے بیانات اور اشخاص و رجال کے دعاوی ہی کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کا حقیقی پس منظر تلاش کرتے ہیں اور بڑے کھلے دل و دماغ کے ساتھ نتائج قبول کرلیتے ہیں۔ حالات اور واقعات کا تجزیہ کرنے میں اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو اثر انداز نہیں ہونے دیتے، ان کے نزدیک ہر کشمکش اور خوں ریزی جو اسلام کے نام پر کی گئی اس کے پس منظر میں اسلامی جذبہ ہی کارفرما نہ تھا۔ بعض اوقات یہ مخصوص سیاسی رجحانات اور گروہی مفادات کی کشمکش اور جنگ ہوئی اور اس میں اسلام کو بطور ایک آلہ کے استعمال کیا گیا۔ مثلاً سرمدؒ کا قتل کوئی اسلامی مسئلہ نہ تھا، اس کا پس منظر قطعی سیاسی تھا۔ عالمگیر ایک مذہبی اور راسخ العقیدہ شخص تھا لیکن داراشکوہ کے مقابلے میں اس کی جدوجہد قطعی سیاسی تھی۔ مذہبی شخص ہونے کے ساتھ وہ ایک سیاسی اور عملی انسان بھی تھا۔ جانتا تھا کہ اگر وہ داراشکوہ کے مقابلے میں نہ آئے اور سیاست و حکومت سے بے نیازانہ ہاتھ کھینچ لے، جب بھی اسے کسی گوشے میں اطمینان و سکون سے نہ بیٹھنے دیا جائے گا۔ اور بہر صورت اسے حکومت کے راستے کا بھاری پتھر ہی سمجھا جائے گا۔ کشمکش اور جنگ لازمی تھی پس اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ خود ہی حکومت و اقتدار کے دوسرے مدعی کو کیوں نہ اپنے راستے سے ہٹا کر اطمینان و سکون حاصل کرے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اگر داراشکوہ ٹھیک وہی عقائد رکھتا ہوتا جو عالمگیر کے تھے جب بھی اس کشمکش سے نہ بچا جاسکتا تھا۔ جنگ لازمی تھی۔ پس عالمگیر نے وہی کیا جو ایک مدبر بادشاہ کو کرنا چاہیے تھا۔ داراشکوہ کے مقابلے میں عالمگیر کی جدوجہد کے بارے میں جو عام تصور ہے، مولانا اس سے پوری طرح متفق نظر نہیں آتے۔

مولانا عبید اللہ سندھی زندگی میں غلط رسوم کی تردید ضرور کرتے ہیں لیکن رسوم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔ مولانا آزاد یہاں بھی ان کے بہت قریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں زندگی بلا مقصد بسر نہیں ہوسکتی، دل کے

اٹکاؤ کے لئے کسی نہ کسی چیز کا ہونا ضروری ہے۔ عوام کی زندگی میں رسوم بڑی اہمیت رکھتی ہیں، وہ رسوم کو اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں جتنا کوئی صاحبِ بصیرت عقیدہ اور مقصد کو عزیز رکھتا ہے۔ اس لئے عوام کی زندگی کو رسوم سے یکسر خالی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی غلط رسم عوام کی زندگی میں وجہ مفاسد بن گئی ہو اور اس کو ختم کرنا ہو تو یکسر اس کے خلاف جدوجہد کی بجائے یہ بہتر ہوگا کہ اس کے رُخ کو موڑا جائے، عوام کی زندگی سے کسی رسم کو بالکل نکال ڈالنا ممکن نہیں، اس قسم کی کوششوں میں کامیابی مشتبہ اور اس کے نتیجہ میں اشتعال، منافرت، کشمکش اور بہت سے سماجی و معاشرتی مسائل کا اٹھ کھڑا ہونا اور دیگر خرابیوں کا پیدا ہو جانا قطعی و لازمی ہوتا ہے۔ اس بارے میں مولانا آزاد اور مولانا سندھی دونوں کا نقطۂ نظر ایک ہے، اس لئے کہ دونوں ایک ہی سرچشمہ یعنی حضرتِ شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم و افکار سے سیراب ہوئے ہیں، مولانا سندھی کے بارے میں تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ حضرت شاہ صاحب سے کس قدر متاثر ہیں۔ مولانا آزاد بھی صحیح مسلک کی طرف رہنمائی کرنی چاہتے ہیں تو مجدد علوم و معارف اور معلم و مربی اصحاب استعداد، حضرت شاہ ولی اللہ کی تفہیمات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں، فرماتے ہیں :-

"جو رسوم و زوائد عوام کے مذہبی عقائد میں داخل ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم عوام کے جذبات کو مشتعل کریں، اس سے اصلاح نہیں ہو سکتی اور نئی اجتماعی مضرتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ چاہئے کہ نہایت صبر و تحمل سے کام لیا جائے، ان جذبات کو بلا ضرورت ٹھیس نہ لگے، اشتعال انگیز صورت نہ ہو، فریقانہ نزاع کی شکل حتی الامکان پیدا نہ کی جائے، بیان میں سختی و گرمی نہیں ہونی چاہئے، بہتر یہ ہے کہ تعیین و تسمیہ کے ساتھ رد و طعن بالکل نہ کی جائے عملاً ایسی فضا پیدا کرنی چاہئے اور عملاً ایسے وسائل اختیار کرنے چاہئیں کہ خود بخود ان اعمال کی شگفتگی اور رونق ماند پڑ جائے اور ان میں کشش و دل ربائی باقی نہ رہے۔ شاہ صاحب نے تفہیمات کی ایک تفہیم میں اپنی عادت کے مطابق اس کے مبادیات و اصول بتانے چاہے ہیں اور بہت قیمتی فوائد لکھے ہیں۔" [1]

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۹۸

بہت سے قومی و ملکی اور سیاسی و سماجی معاملات و مسائل میں مولانا سندھی کا جو تصور ہے وہ مولانا آزاد کے تصورات سے مختلف نہیں، ایک ہی تصور اور ایک ہی نظریہ ہے جس کا دو مختلف زبانوں سے اظہار ہو رہا ہے زیادہ سے زیادہ فرق ترتیب مقدمات یا تفصیلات میں یا زبان و بیان میں ہو سکتا ہے، لیکن انداز فکر اور اصول میں کوئی فرق نہیں۔

ایک بڑی چیز دونوں کے یہاں عقیدے اور مسلک کا امتیاز ہے، مسلک سے میری مراد یہاں محض پالیسی اور کسی کام کے لئے مناسب طریقۂ کار سے ہے۔ وقتی مصالح اور ضروریات و حالات کے پیش نظر جو لائحۂ عمل بنایا جاتا ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم اور بعض اوقات اس کا ترک کرنا بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی کہ عقیدے سے روگردانی۔ لیکن اصولاً طریقۂ کار اور پالیسی کو کسی وقت بھی بدلا جا سکتا ہے، لیکن عقیدے کو جو حیثیت زندگی میں حاصل ہوتی ہے وہ پالیسی سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ عقیدہ کو نہ کسی طرح چھوڑا جا سکتا ہے نہ وقتی مصلحتوں کی خاطر اور حالات کی سنگینی کی وجہ سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ طریقۂ کار اور پالیسی کو عقیدہ کی جگہ نہیں دی جا سکتی، مولانا سندھی فرماتے ہیں :-

"وقتی مصالح، قومی رجحانات اور ملکی ضروریات کی حیثیت اپنی جگہ بالکل مسلّم ہے اور ان کی بناء پر جو قاعدے اور ضابطے بنتے ہیں ان کی بھی زندگی میں بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن ان کو عالمگیر مذہب کے ارکانِ اصل بنا لینا یہ غلطی ہے۔"[1]

اس کے بعد برصغیر پاک و ہند کی سیاسی زندگی سے ایک مثال دے کر اس اصول کی مزید وضاحت فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے موجودہ حالات میں زبردست رعایا کے پاس حاکموں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لئے سوائے عدم تشدد کے اور کوئی حربہ نہیں اور اگر نہتی رعایا تشدد پر اُتر بھی آئے تو اس کے پاس نہ تو تشدد کے ہتھیار ہیں اور نہ اس میں اتنی ہمت ہے کہ ان ہتھیاروں سے کام لے، اس لئے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ظلم کی مدافعت تو ضرور ہو، لیکن عدم تشدد کے ذریعے ہو، چنانچہ عدم تشدد کا یہ سیاسی مسلک ہندوستان کے خاص حالات اور پھر خاص زمانہ کی ضرورتوں کا نتیجہ ہے، لیکن جب اس مسلک کے قائل ساری قوموں کو عدم تشدد کا اپدیش دیتے ہیں اور دنیا کو یہ باور کرانے کی

[1] مولانا عبید اللہ سندھی، از پروفیسر محمد سرور صاحب۔

کوشش کرتے ہیں کہ عدم تشدد ہی عالمگیر صداقت کا اصل اصول ہے تو یہ ان کی زیادتی ہوتی ہے۔[1]

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی تقاریر وتحاریر میں کئی جگہ ٹھیک انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے، انڈیا ونس فریڈم میں گاندھی جی سے اپنے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان کے لئے (گاندھی جی کے لئے) اصل معاملہ ہندوستان کی آزادی نہیں بلکہ پیس فزم (PACIFISM) یعنی عدم تشدد پر مبنی امن عالم تھا۔ میں کھلم کھلا کہتا تھا کہ کانگریس پیسی فسٹ ادارہ (PACIFIST ORGANIZATION) نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ہندوستان کو آزاد کرانا ہے"۔ صفحہ ۳۳)

اس سلسلے میں مزید فرماتے ہیں:۔

"میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا مگر اپنے آپ کو ان سے (گاندھی جی سے) اتفاق کرنے پر آمادہ نہ کرسکا۔ میرے لئے عدم تشدد مصلحت کی بات تھی، عقیدے کی نہ تھی، میری رائے تھی کہ اگر کوئی چارہ نہ ہوتا تو ہندوستانیوں کو اس کا حق تھا کہ تلوار سے کام لیں۔ لیکن پُرامن طریقوں سے آزادی حاصل کرنے میں عظمت و شرافت زیادہ تھی، اور بہرحال ملک کی جو حالت تھی اسے دیکھتے ہوئے گاندھی جی کا مسلک صحیح تھا۔" (صفحہ ۳۴)

مولانا اسے صرف اس لئے اختیار کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے موقتہ سیاسی حالات میں وہ صحیح طریقہ کار تھا نہ کہ صحیح عقیدہ! فرماتے ہیں:

"عدم تشدد ہندوستان کو آزاد کرانے کا صحیح طریقہ ہے اور اسے قائم رکھنا لازمی ہے" (صفحہ ۳۴)

جس طرح دونوں بزرگ رہنما عقیدہ اور مسلک میں فرق کرتے ہیں اسی طرح دونوں بزرگ "اصل وتعبیر" کی تفریق میں بھی متحد الفکر نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد نے یہود ونصاریٰ اور دنیا کی بہت سی گمراہیوں کی بنیاد اصل وتعبیر میں عدم تفریق وامتیاز کو قرار دیا ہے۔ یعنی گمراہی یہ نہ تھی کہ اصلاً حقیقت ان کی نظروں سے پوشیدہ ہوگئی تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ اصل وتعبیر کے فرق وامتیاز کو انھوں نے نظر انداز کردیا تھا اور حقائق کی تعبیرات وتمثیلات کو اصل سمجھ لیا تھا، اس پر جس قدر زمانہ گذرتا گیا گمراہیاں بڑھتی گئیں اور اختلافات زیادہ ہوتے گئے۔ اس سے ایک اور حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اختلاف مذاہب دور کرنے اور کسی ایک ہی حقیقت کا والہ وشیدا

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھی۔ از پروفیسر محمد سرور صاحب ص ۲۵۶

بنانے کے لئے یہ طریقہ ہرگز سود مند نہیں ہو سکتا کہ کسی مذہب کا یکسر انکار اور کلیتہً تردید کی جائے، بلکہ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ مذہب کی اصل و حقیقت سے پردے ہٹائے جائیں اور تعبیرات کی بھول بھلیوں سے اہلِ مذہب کو نکالا جائے یہ مذہب اور انسانیت دونوں کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ جس روز اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی تمام اختلافات ختم ہو جائیں گے اور دنیا اس حقیقت کو پالے گی جس کی طرف تمام ہادیانِ کرام نے انسانوں کو بلایا تھا۔ اور جس کو "الاسلام" کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دونوں بزرگ معاملات و مسائل پر صرف منطقی اور نظری اعتبار ہی سے غور و فکر نہیں کرتے بلکہ وہ کسی مسئلے کے عملی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔ اس طرح دونوں کے افکار کی ایک بڑی خصوصیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان کو عملی سانچوں میں ڈھالا جائے تو ان کی شکل میں ادنیٰ تغیر نہ ہوگا۔ ان کے افکار کی یہ خصوصیت اس لئے بھی ہے کہ وہ محض عالم اور مفکر ہی نہ تھے عملی آدمی بھی تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی مذہبی سیاسی زندگی میں کئی ایسے بزرگوں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن کی تحریریں فکری و نظری اور منطقی استدلال کے لحاظ سے بڑی خوشنما نظر آتی ہیں اور ذہن و دماغ ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں لیکن اگر ان خیالات کو عمل میں لانے اور ان کے مطابق معاشرہ اور سیاسی زندگی کی تعمیر کی کوشش کی جائے تو پوری کامیابی ممکن نہ ہوگی یا وہ خیالات اپنی خوشنمائی اور دل ربائی کھو بیٹھیں گے۔ یہ ساری خرابی مسئلے کے عملی پہلو کو نظر انداز کر کے سوچنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس قسم کی تحریک کو منطقی، کلامی، کتابی یا رومانی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تحریک کا کسی فکری و نظری تحریک سے تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے، اور بلاشبہ اس کی اپنی جگہ پر اہمیت اور افادیت بھی ہے۔ لیکن عملی اور انقلابی تحریک کے مقابلے میں کوئی ایسی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، اس دنیائے عمل و انقلاب میں مسائل و معاملات کو صرف منطق و کلام سے طے نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ہمارے لئے مفید انداز فکر مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد ہی کا ہو سکتا ہے۔

دونوں بزرگ تعصب سے پاک۔ دونوں میں ہمہ گیر وسعتِ قلبی اور ساری انسانیت کو آغوشِ محبت میں چھپا لینے کا جذبہ رکھتے ہیں، دونوں وحدتِ انسانیت اور عالمی انسانی برادری کے قیام کے داعی ہیں، حالانکہ ہمارے یہاں بہت سے علماء وحدتِ انسانیت اور عالمی انسانی برادری کے مفہوم ہی سے نا آشنا ہیں۔

افکار و خیالات اور اندازِ فکر کے لحاظ سے دونوں شخصیتیں بہت قریب نظر آتی ہیں، اس کے باوجود دونوں

کی اپنی مستقل شخصیتیں ہیں، دونوں کی خصوصیات جداگانہ ہیں۔ مثلاً ابوالکلام آزاد ایک داعی وخطیب ہیں تو مولانا عبیداللہ سندھی معلم و مدرس ہیں، مولانا آزاد کی تحریر سے جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے تو مولانا سندھی کی تحریر سے فکر کو جلا ملتی ہے۔ ابوالکلام کی تحریر مقصد کا عشق پیدا کر کے منزلِ دار و رسن پر دوڑا دیتی ہے، سندھی کی تحریر سے ہم اس راہ پر گام زنانی کی بجائے، افکار میں کھو جاتے ہیں۔ ابوالکلام کی تحریر ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ سندھی کی تحریر فکر انگیز ہوتی ہے۔ مولانا آزاد ایک بات کو لیتے ہیں، اس کو سمجھاتے ہیں، اس کی اہمیت واضح کرتے ہیں اور دل میں اس کا عشق پیدا کر کے جذبۂ عمل کو بیدار کر دیتے ہیں، مولانا سندھی کی فکر بعض اوقات واضح نہیں ہوتی، غور و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے، جذبۂ بیدار ضرور ہوتا ہے، لیکن جوشِ عمل و حرکت پیدا نہیں ہوتا۔ ابوالکلام عمل سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لئے امام ابن تیمیہ اور امام احمد بن حنبل وغیرہ ان کے ممدوح ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مقابلے میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کا تذکرہ انھوں نے زیادہ والہانہ انداز میں کیا ہے، ان کے نزدیک اصل چیز عمل اور استقامت وعزیمت ہے لیکن مولانا عبیداللہ سندھی فکر پر جان دیتے ہیں اس لئے حضرتِ اسمٰعیل شہید کے مقابلے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ ان کا مرکزِ عقیدت ہیں —— مولانا آزاد میں مولانا سندھی کے مقابلے میں انانیت وخود پرستی زیادہ ہے، اس لئے انھوں نے اپنی شخصیت کو کہیں فنا نہیں ہونے دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے افکار اور ان کے مسلک سے وہ بہت متاثر ہیں لیکن ان کے مسلک کا بظاہر تتبع اور ان کے افکار میں خود کو فنا نہیں کیا، ان کے افکار کو اپنی شخصیت میں رچا بسا لیا ہے، ان کے مقابلے میں مولانا عبیداللہ سندھی نے حضرت شاہ صاحب کے افکار میں خود کو فنا کر دیا ہے۔ مولانا آزاد کا مذہب عشق اور مولانا سندھی کا مذہب عقل ہے —— لیکن جس طرح مولانا آزاد کا مذہب عشقِ عقلی ہے اسی طرح مولانا سندھی کو اپنے مذہب عقل سے عشق ہے ——!!

حضرتِ ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط

مرتبہ و مترجمہ: ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب

شروع میں حضرت صدیقؓ کے حالات کے متعلق ایک بصیرت افروز تعارف، پھر خطوط کا ترجمہ اور آخر میں عربی کے اصل مکتوبات۔ صفحات ۲۰۶ بڑی تقطیع، قیمت -/۴ — مجلد -/۵

ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶